پروفیسر آسی ضیائی مرحوم

حفیظ الرحمٰن احسن ○

استاذ محترم پروفیسر آسی ضیائی مرحوم (۱۹۲۰ء-۲۰۰۹ء) جن کا اصل نام امان اللہ خان تھا، سے پہلی ملاقات ۱۹۵۱ء میں مرے کالج سیالکوٹ کی لائبریری اور ہوسٹل کے درمیان واقع ایک چھوٹی سی مسجد میں ہوئی (اس کالج کے شعبہ اُردو سے وہ یکم اکتوبر ۱۹۴۸ء کو بطور لیکچرار اُردو وابستہ ہوئے تھے)۔ روشن چہرہ، کشادہ پیشانی اور رعنائی شباب کی کشش لیے ہوئے اس شخصیت سے اولین ملاقات کا ایک خوش گوار تاثر ہمیشہ ذہن میں محفوظ رہا۔ یہ خوش گواری محض ایک خوب صورت اور محترم شخصیت کی ملاقات کا تاثر تھا یا اس کا کوئی سبب اور بھی تھا؟ ماضی کے اوراق کی خاصی اُلٹ پلٹ کے بعد یہ عُقدہ کھلا کہ اُن سے یہ ملاقات کسی اجنبی سے ملاقات نہ تھی بلکہ ایک غائبانہ شناسا شخصیت سے بالمشافہہ ملاقات تھی۔ ایک ادبی اور علمی شخصیت کی حیثیت سے ان کی تحریروں کے حوالے سے شناسائی پہلے سے موجود تھی۔ میں نے ۱۹۵۱ء میں مرے کالج میں سالِ اول میں داخلہ لیا تو اُس زمانے تک چراغِ راہ کے وسیلے سے ان کے نام سے واقف ہو چکا تھا۔

استاذِ محترم سے ملاقاتوں کا سلسلہ پھر یوں مستقل ہو گیا کہ جماعت اسلامی شہر سیالکوٹ کے ہفتہ وار اجتماعات میں باقاعدگی سے شرکت ہوتی تھی، جہاں آسی صاحب کے ذمے بھی کوئی تقریر یا گفتگو پروگرام میں شامل ہوتی تھی۔

○ مدیر، سیارہ، لاہور

جہاں تک یاد پڑتا ہے ان کی پہلی ادبی تحریر جو مجھے پڑھنے کا موقع ملا، وہ ان کا وہ مفصل محاکمہ تھا جو انھوں نے محترم نعیم صدیقی کے مرتب کردہ چراغِ راہ کے ضخیم 'شعر نمبر' پر لکھا تھا۔ یہ خاص نمبر ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا اور یہ حلقۂ ادب اسلامی پاکستان کے ادبی محاذ کی سرگرمیوں کا ایک بھرپور تعارف پیش کرتا تھا۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں شائع ہونے والے چراغِ راہ ہی کے ضخیم 'خاص نمبر' میں جناب آسی کی شخصیت کا تعارف نعیم صدیقی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا (یاد رہے کہ اس زمانے میں آسی صاحب اپنا نام عاصی ضیائی رام پوری لکھتے تھے)۔ نعیم صاحب لکھتے ہیں:

> عاصی ضیائی ہے تو رام پوری، مگر رام پور کی مخملی ٹوپی سے بالکل مختلف! اُجلا اور چوڑا چہرہ، شخصیت کا ترجمان! ـــــ ہاتھ میں ہمیشہ چرمی کاغذات دان، اور اس کاغذات دان میں اُردو بحیثیت گھر کی زبان محفوظ۔ کسی خانے میں روزمرہ، کسی میں محاورہ، کسی میں گُل بکاولی اور چہار درویش کی زبان، کسی میں اخلاقِ جلالی کی، کسی میں بائبل کے ترجمے کی! زبان جس شخص کے گھر کی ہو، اُسے قدرت چاہے پروفیسر ہی بنائے رکھنے پر کیوں نہ بضد ہو، وہ ادیب بنے بغیر رہ ہی نہیں سکتا ـــــ یُوسف کے وعظ کا مصنف! ہمارا واحد تمثیل نگار! خاکہ اُڑانے کا ماہر، تنقیدی انفرادیت کا حامل!

اس زمانے میں تحریکِ ادبِ اسلامی نے چند برسوں میں ثقہ اہلِ قلم کی روشن کہکشاں راستہ کر لی تھی، جس کی وسعت اور تابندگی میں ۱۹۵۸ء تک بہت قیمتی اضافہ ہو چکا تھا، لیکن ۱۹۵۸ء کے مارشل لا نے اس تحریک کو ایسا نقصان پہنچایا کہ اس پر صرف ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔ بعد میں یہ محفل پھر کبھی اس شان کے ساتھ آراستہ نہ ہوسکی۔ بقول شاعر ؎

چھٹے اَسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا
نہ بہار تھی، نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا

استاذ محترم کی پوری زندگی درس و تدریس اور شعر و ادب کے میدان میں مختلف النوع انداز کی تصنیف و تالیف میں گزری۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے نیازی اور ایک حد تک اِنفعالی روش کے اثرات رہے۔ وہ کسی زوردار تحریک کے بغیر نہیں لکھتے تھے، خواہ وہ تحریک داخلی ہو یا خارجی۔ ان سے ادب کے میدان میں بہت کام لیا جاسکتا تھا لیکن اگر ایک طرف وہ بے نیاز اور گوشہ گیر رہنا

پسند کرتے تھے، تو دوسری طرف کوئی ایسا فعال ادبی حلقہ یا ادارہ بھی موجود نہ تھا جو اُن سے ان کے مقام ومرتبہ کے مطابق کام لیتا۔ تاہم اس کے باوجود وہ مختلف اصنافِ ادب میں اتنا قیمتی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں جو اپنی جگہ بے حد وقیع ہے اور پوری طرح ادبِ صالح اور ادبِ نافع کی تعریف میں آتا ہے۔ اگر اُن کے چھوڑے ہوئے سرمایۂ ادب کے بھرپور تحقیقی مطالعے کی کوئی سبیل نکلے تو اندازہ ہوگا کہ وہ کیا گوہرِ گراں مایہ تھا جس کی اب تک پوری طرح پہچان نہ ہوسکی۔ ان کے مقام ومرتبے کی حقیقی قدرشناسی (evaluation) کے ساتھ اُردو ادب کا تعمیری رُجحان رکھنے والی ایک قدآور ادبی شخصیت کا بھرپور تذکرہ ایک منارۂ نور کی صورت میں آنے والوں کے لیے محفوظ ہوسکتا ہے۔

آسی ضیائی کی تصنیفات وتالیفات کا سرسری تعارف کرانے کے لیے بھی کئی صفحات درکار ہیں جس کی یہاں گنجایش نہیں۔ صرف چند کتابوں کے نام ملاحظہ فرمایئے: ● کھوٹے سکّے (۱۹۵۰ء)، افسانے، ڈرامے، تراجم ● کلامِ اقبال کا بے لاگ تجزیہ (۱۹۵۷ء) کلامِ اقبال کا ایک نئے رُخ سے تجزیاتی مطالعہ ● شب تاب چراغاں (۱۹۵۷ء) اُردو شاعری کا عہد بہ عہد مطالعہ، ہر عہد کے نمایندہ شعرا کے کوائف اور نمونۂ کلام کے حوالے سے ● دُرست اُردو (۱۹۶۰ء) اصلاحِ زبان وتلفظ کے موضوع پر کتاب ● تاریخ زبان و ادب اُردو (۱۹۹۲ء) اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانات کے لیے نصابِ مطالعہ ● تحسینِ اُردو (۱۹۶۸ء) اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لیے قواعد وانشا کے موضوع پر ایک کتاب۔ شریک مصنف: طاہر شادانی، حفیظ الرحمٰن احسن ● رگِ اندیشہ (۱۹۹۴ء) مجموعۂ نظم وغزل ● یادیں کچھ کرداروں کی (۱۹۹۷ء) ریاست رام پور کے بعض ناقابلِ فراموش کرداروں کی قلمی تصویریں ● داستان گوانیس (۱۹۹۷ء) انیس کی مرثیہ گوئی کا ایک انقلابی رُخ سے مطالعہ ● ترجمہ انجیل برناباس (۱۹۷۴ء) بائبل کے اسلوب میں اس نایاب کتاب کا معرکہ آرا ترجمہ۔ خیال رہے کہ اس کتاب کا ترجمہ سید مودودیؒ کی خصوصی تحریک پر انھی کے فراہم کردہ انگریزی اڈیشن سے کیا گیا۔ یہ انجیل حضرت عیسٰیؑ کی حقیقی تعلیمات کا سب سے صحیح بیان ہے۔

آسی صاحب کے بے شمار مقالات مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں جن کو جمع کرکے کتابی صورت میں یک جا شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

موصوف کے ذاتی کوائف میں چند چیزیں خاص طور پر لائقِ تذکرہ ہیں لیکن یہاں ان کے بھی صرف عنوان ہی لکھے جاسکتے ہیں۔ایک، ان کے استاذ اور اُردو ادب کی ایک قدآور شخصیت پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کے بارے میں اُن کے تاثرات۔ دوسرے، سید مودودیؒ کی طرزِ نگارش اور فکری و علمی انداز استدلال کے بارے میں ان کا دل چسپ اور فکرافروز مطالعہ وتبصرہ۔ تیسرے، اپنے استاذ محترم رشید احمد صدیقی کے اسلوبِ گفتار کی پیروی میں ان کے بعض دل چسپ اقوال، مثلاً: محکمۂ تعلیم میں بالعموم وہ لوگ آتے ہیں، جو کرتو بہت کچھ سکتے ہیں، لیکن اپنی علم دوستی یا عمل دشمنی کی وجہ سے کرتے کچھ نہیں۔ چوتھے، ان کا غیر معمولی حافظہ کہ بعض اوقات برسوں پہلے کی سنی ہوئی بعض نظمیں بے تکلف سنا دیتے۔ کبھی گفتگو میں اچانک کہتے کہ ۲۵،۳۰ سال پہلے (مثال کے طور پر) چند اشعار ہوئے تھے جو تحریری طور پر محفوظ نہیں ہیں لیکن ایک شعر کچھ اس طرح تھا۔ پھر اس کے بعد دوسرا، پھر تیسرا شعر چلا آتا اور اس طرح مدتوں پہلے کی کہی ہوئی پوری نظم سنا دیتے!

ان کی شخصیت کا ایک منفرد پہلوان کا وہ پُرتپاک اندازِ ملاقات تھا جب وہ ہر آنے والے سے خلوص و محبت، گرم جوشی، خندہ پیشانی اور مسکراتے چہرے سے ملتے تھے۔ دورانِ گفتگو حسبِ موقع پرانی یادوں اور کسی اہم بات کا تذکرہ، نیز اپنے مخصوص انداز میں اشعار سنانا ہمیشہ یاد رہے گا ؎

وَے صورتیں الٰہی، کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

یکم اگست ۱۹۲۰ء کو رام پور میں جنم لینے والی یہ یگانۂ روزگار شخصیت مختصر سی علالت کے بعد ۱۴ جنوری ۲۰۰۹ء کی دوپہر کو اپنے خالقِ حقیقی سے جاملی۔ اس شام جنازے کے وقت ان کے چہرے پر وہی تابانی تھی جو ۵۸ سال پہلے میں نے ان کے چہرے پر دیکھی تھی۔ نمازِ جنازہ محترم قاضی حسین احمد نے پڑھائی اور مرحوم کی شخصیت کا تذکرہ بڑی خوب صورتی اور محبت کے ساتھ فرمایا۔ بالآخر اقبال ٹاؤن کے اس قبرستان میں آسودۂ خاک ہوگئے جہاں ہمارے بہت سے تحریکی بزرگ پہلے سے جنت کے باغوں میں محوِ استراحت ہیں ـــــ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ!